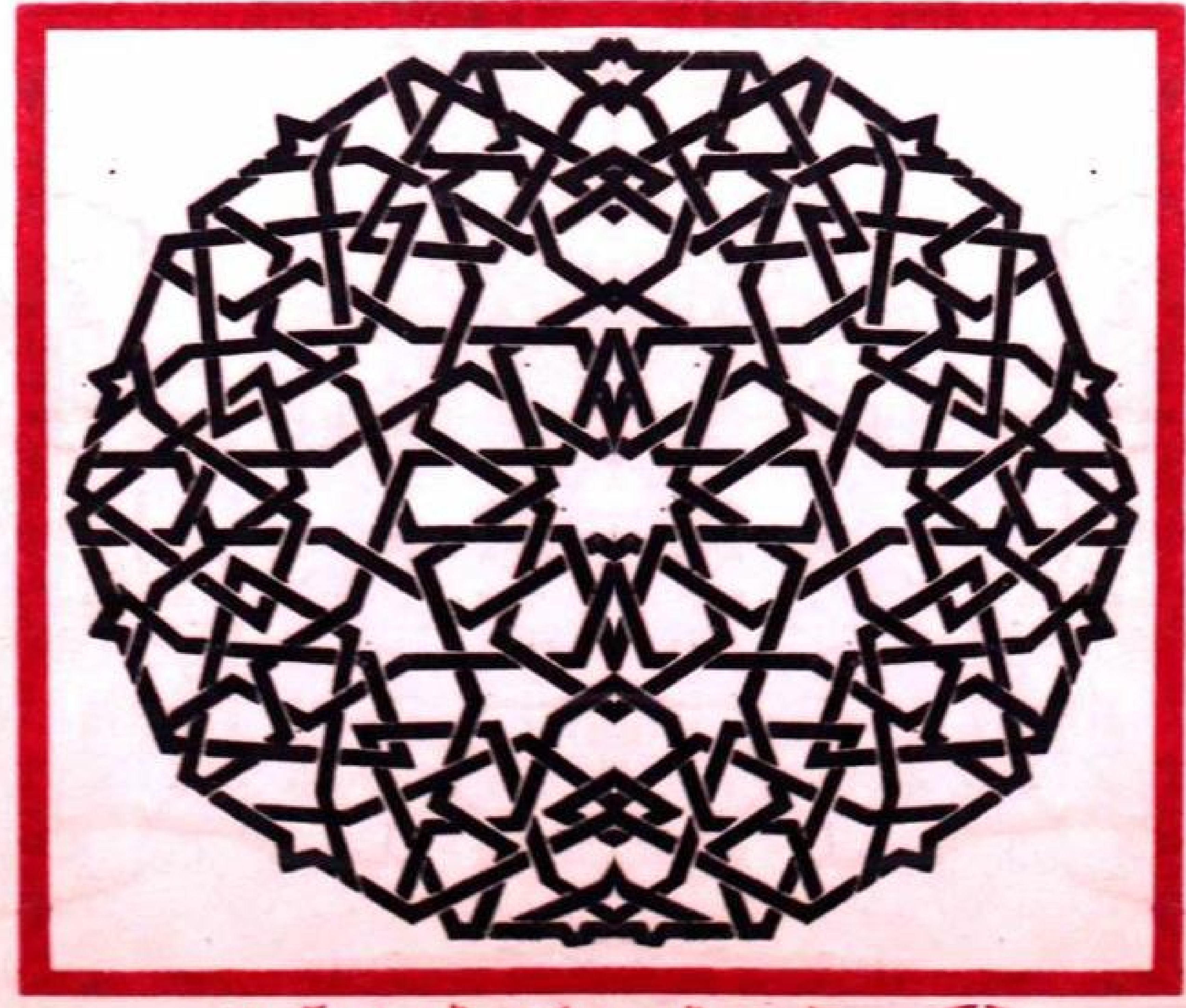
غالب

اور اس کی شاعری

احمد الدین احمد



اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

غالب

اور اُس کی شاعری

احمد الدین احمد

لٹریری بک سنٹر

۱۲۶ رچک ، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور
ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں

کتاب کا نام : غالب اور اس کی شاعری
مصنف : احمد الدین احمد مارہروی
کتابت : سید محمد خورشید جمیل
طباعت : اسرار کریمی پریس، الہ آباد
اشاعت : ۱۹۹۶ء
تعداد : ۵۰۰
قیمت : دس روپے
ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، ایل۔ آئی۔ جی - ۱۰
نیم سرائے۔ اے ڈی اے۔ کالونی
منڈیرا چک۔ الہ آباد ۲۱۱۰۱۱
تقسیم کار : لٹریری بک سنٹر۔ ۱۲۶ چک، الہ آباد ۳

غالب اور اُس کی شاعری

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب"
مندرجہ بالا الفاظ سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مضمون "محاسن کلام غالب" شروع ہوتا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ شاعری فنون لطیفہ میں سے افضل ترین فن ہے اور مرور ایام کے ساتھ نہ صرف اس کی وسعت، بلکہ اہمیت، ضرورت اور قدر و منزلت بڑھتی جائے گی۔ میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ "نظم کا مستقبل بہت وسیع ہے کیونکہ اس میں استقلال اور تخیل کا عنصر غالب ہے۔ نظم کے لئے تخیل ہی خاص چیز ہے۔ باقی ایک عالم واہمہ ہے۔ نظم اپنی قوت متخیلہ کو خیالات سے وابستہ رکھتی ہے۔ اور یہ خیالات ہی واقعات ہیں۔

مستقبل نظم کے وسیع ہونے میں شک نہیں، جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا، یونانی عہد عتیق کے وہ فنون جو قرون وسطیٰ میں لاعلمی، تعصب اور جہالت کے باعث قعر گمنامی میں پڑے ہوئے تھے از سر نو تازہ ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ ناٹک نویسی، موسیقی اور فن نظم دور حاضرہ میں نہ صرف نصاب تعلیم کے جزو اعظم ہیں۔ بلکہ کسی قوم کے شائستہ اور متمدن ہونے کے لئے فرض

ہے کہ وہ ان کا اکتساب کرے۔

غدر دہلی کے بعد جو بمنزلہ ہندوستانی نشاۃ جدید کے تھا۔ ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ طبقہ ان فنون کی اہمیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ پہلے فن نظم میں جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنی گذشتہ عظمت کی یادگار باقی رہ گیا تھا۔ اصلاحات اور تجدید عمل میں آئی۔ اس دور کا پیش رو غالب ہے، اس نے نہ صرف قدیمی بے رنگ شاعری کو جو محض گل و بلبل کا افسانہ، فراق و وصال کی داستان اور پوچ خیالات کا ڈھیر رہ گئی، بدلا، بلکہ اس میں ایسی روح پھونک دی جس سے باوجود ظاہری صورت کے بہت کم مبدل ہوتے کے صور معنوی میں کیف اور چاشنی پیدا ہوگئی۔

اوّل اوّل جس طرح انگلستان کے ملک الشعراء ورڈزورتھ کو عامۃ الورود شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح غالب پر بھی لکیر کے فقیر شعراء کی نکتہ چینیوں اور پبلک کے مذاق کی خرابی کا اثر پڑا۔ جس طرح اسکاٹ اور بائرن کے سامنے ورڈسورتھ کی شہرت نہ ہوئی۔ اسی طرح ذوق اور مومن خاں کے سامنے کسی نے دور جدید کے پیغمبر کی پرواہ نہ کی، لیکن قابلیت، جدت، خوبی بیان اور حسن معانی اہل بصیرت کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ نشاۃ جدید کے بعد مغربی خیالات کا دور دورہ ہوا۔ ہم نے ان کے اور انھوں نے ہمارے علم ادب کا اکتساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کس دنیائے رفیع میں ہیں۔ اور ہم کس قعر مذلت میں۔ انھوں نے جائز طور پر ہمارے فن نظم کو ارذل ترین کہا بلکہ آج تک اسی خیال میں

ہیں) اس تاریکی میں صرف ایک شمع تھی، ایک شاعر تھا جس کو ہم اہل یورپ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے تھے، جس کے اشعار میں ہم اپنی قوم کی عظمتِ رفتہ کے آثار، اور آیندہ بہبودی کی امید پا سکتے تھے۔ وہ غالب تھا جو اپنے سامعین اور ناظرین کے ہاتھوں پریشان اور ناقدر شناس اصحاب کی نکتہ چینیوں سے پریشان ہو کر کہہ رہا تھا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یا

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ   کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

تمام اہل السان متفق ہیں کہ اردو کے شاعری کے تین ارکان ہیں۔
میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ :۔

اِک اثر میں بڑھ گیا، اِک رفعت تخیل میں ....

گویا غالب دنیائے تخیل کا بادشاہ ہے۔ اور تخیل وہ چیز ہے جو دنیا کو ایک دم میں تہ و بالا کر دیتی ہے۔ یہ روسو کا تخیل ہی تھا جو (ایک بڑی حد تک) انقلاب فرانس کا بانی ہوا۔

زبانِ اردو میں شعراء اور اساتذہ کی کمی نہیں۔ سوداؔ، میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ انشاؔء، جراءتؔ، ناسخؔ سے لے کر جرکینؔ اور جانؔ صاحب تک ہر فن کے استاد موجود ہیں۔ اور اپنی گذشتہ عظمت کی یادگار بڑے بڑے دیوان چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن جو "مجموعہ اردو" کہ غالب نے چھوڑا ہے وہ دلچسپی، نفاست، تعمق اور وسعت نظری میں لاجواب اور بے مثل ہے۔

اور بے مثل و لاجواب ہی رہے گا۔ لوگ نقالی کریں گے اور اپنے رنگ کو اختیار کر کے مثل دیوان غالب کے ایک کتاب تصنیف کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر جس طرح قرآن مجید، مثنوی مولانا روم اور گلستان کا جواب لکھنا ناممکن ہے، اسی طرح شیکسپیر اور غالب کے پایہ کو پہنچنا امر محال۔

میتھو آرنلڈ نے ورڈسورتھ کی بابت لکھا ہے کہ اس کا کلام امتداد زمانہ کے ہاتھوں برباد نہ ہوگا۔ بلکہ مشاہیر شعراء کے مجموعہ سے زیادہ دیر پذیر رہے گا۔ اگر یہی دعویٰ غالب کے لئے بھی کیا جائے تو حق بجانب ہوگا غالب موجودہ نسلوں کے لئے منبع انبساط ہے۔ اور آیندہ نسلوں کے لئے بھی منبع انبساط رہے گا۔ شارحین ان اشعار کو جن کے متعلق بے معنی اور مہمل ہونے کی عام شکایت ہے لیکن جو دراصل گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں واضح اور صاف کر کے دکھا رہے ہیں اور وہی لوگ جو معمولی استعداد کے باعث ان کا اصل مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ اور ان کو ہذیان سے زیادہ نہ سمجھتے تھے، قائل ہو رہے ہیں کہ غالب کا کلام ذوق، مومن، داغ وغیرہم سے کہیں زیادہ تخیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے خیالات سطحی زبان عامی اور بندشیں پرانی تھیں۔ جو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی تھیں۔ لیکن غالب جمہور کا شاعر نہ تھا، اس کا پیام صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن میں اس سے مستفیض ہونے کی قابلیت اور صلاحیت ہے نہ کہ ان اصحاب کے لئے جو میر فرش بن کر واہ واہ کرنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

وہ داد نہیں چاہتا بلکہ عمل کا خواہش مند ہے۔ ع

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

اس کا کلام تصوف اور فلسفہ میں ڈوبا ہوا ہے جو عوام کا حصہ نہیں۔ بلکہ چند اور صرف معدودے چند اصحاب کے لئے ہے۔ لیکن جس طرح شیکسپیر کے لئے ہزلٹ بریڈلے، جانسن اور سر سیڈنی لی جیسے حواشی نگاروں کی ضرورت تھی جو اس کے محاسن کلام، خوبی بیان اور طرز گفتار کو پبلک کے سامنے بہ وضاحت پیش کریں۔ اسی طرح ہمارا غالبؔ بھی عوام سے روشناس ہونے کے لئے حالیؔ اور عبدالرحمٰن بجنوری جیسے اہل قلم کا محتاج تھا اور واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کی عظمت کا آغاز یادگارِ غالبؔ کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ اور جوں جوں ملک میں اس قسم کا لٹریچر بڑھتا جائے گا زمانہ خود اس کی عظمت کو تسلیم کرے گا۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ نظم کا مستقبل بہت وسیع ہے۔ بنی نوع انسان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ زندگی کی ترجمانی کرنے، طمانیت قلب بخشنے اور ہیجان میں سکوت پیدا کرنے کے لئے ہم کو نظم اور صرف نظم سے مدد لینی ہوگی۔ بلا فن نظم کے سائنس اور نیچر ناتمام نظر آئے گی۔

سائنس اور نیچر کے مفید اور دلکش ہونے میں کس کو کلام ہے۔ مگر جب تک قادر الکلام شاعر ہماری آنکھوں کے سامنے بہار کا نقشہ نہیں کھینچتا ہم اس کی اصل خوبصورتی اور سودمندی سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ موسم بہار ہر سال آتا ہے اور چلا جاتا ہے، ہم پھولوں کی تروتازگی

سے مسرور ہوتے ہیں۔ لیکن جب ورڈسورتھ کہتا ہے کہ "سرسبز کنج میں جنگلی گلاب کی جھاڑیوں کے گرد بیچ در بیچ سنبل نے اپنے گجرے بنا رکھے تھے اور میرا عقیدہ ہے کہ ہر پھول نسیم سحری سے حظ حاصل کرتا ہے"۔
"پھولوں کی ڈالیوں نے ہوا لینے کے لئے اپنے پنکھے پھیلا رکھے تھے اور مجھے یقین واثق ہے کہ ان میں خوشی کے نمایاں آثار پائے جاتے تھے"۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کچھ اور بھی ہے۔ جو ان ظاہری صورتوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ لطیف اور زیادہ طاقتور ہے۔ جس طرح الفاظ کی ظاہری صورت کے پیچھے دریائے معانی مواج نظر آتا ہے۔ بعینہٖ ان پھول پتوں کے اندر روح زندگی اور مبدع عالم کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی تعمق نظر سے معنوی حیثیت کا اندازہ کرتا ہے۔

جب غالبؔ نسیم سحری کے متعلق کہتا ہے کہ ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

تو ہم کو ایک نئی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ہم ہزارہا انسانوں کو روز و شب دیکھتے ہیں۔ مگر شاعر ان کی ہستی میں کچھ اور ہی چیز مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

یہی جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر شاعر نے کہا ہے ؎

بُت کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

اور اسی سے متاثر ہو کر میری زبان سے نکلتا ہے۔ ؎

مبدع حسن کی ہے حسن کی دیوی میں تلاش

غالب دیکھتا ہے کہ ہم نیچر کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم ہوا میں شراب کی تاثیر کو مبالغہ اور غلط بیانی سمجھتے ہیں۔ اور عاجز آ کر کہتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

گویا ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ایک معمولی تنکے اور ارزل ترین کیڑے کو بھی عمیق نظر سے دیکھیں، اس کے جسم اور قد و قامت کو نظر انداز کر کے صانع مطلق کی صناعی، جزویات اور اور تجنیتلی پر عش عش کریں۔

ورڈسورتھ شاعری کو جملہ علوم کی روح لطیف اور نفس سمجھتا ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ امر صریحی ہے۔ کیونکہ مبدع علم نے جو اثر نظم میں رکھا ہے۔ وہ نہ مرصع و مقفےٰ نثر میں ہے نہ نثر عاری ہیں۔ اہل عرب جو ایشیائی شاعری کے جد امجد ہیں ہر اس کلام کو جو دل پر جادو کا اثر رکھتا ہو، جس سے ہمارے جذبات خفتہ مشتعل ہوتے ہیں، شعر کہا کرتے تھے۔ چنانچہ جب قرآن پاک کی آیات کریمہ نازل ہوئیں اور ان کا فوری اثر دیکھا گیا کہ لوگوں نے مذہب جیسی اہم ترین اور ضروری شے کو اس سے متاثر ہو کر ترک کر دیا تو انھوں نے اس کو بھی شعر سے تعبیر کیا۔

اس لحاظ سے گویا شعر جتنا پُر اثر ہو گا اتنا ہی بلند پایہ۔ مگر شعر کے لئے صرف پُر اثر اور بلند پایہ ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ چند اوصاف اور بھی ہیں جن کے بغیر شعر، شعر کہے جانے کا مستحق نہیں۔

میتھو آرنلڈ اس مبحث پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ نظم میں اعلیٰ و اسفل، معقول اور غیر معقول یا نیم معقول، صادق و کاذب یا نیم صادق کی تفریق اہم ترین ہے۔ اعلیٰ نظم وہی ہے جس میں ہمارے جذبات کو مشتعل کرنے، ہمیں خوش رکھنے اور ہمارے اندرونی خیالات کی تصدیق کرنے کی قدرت ہو۔ اس اصول کے مطابق شعر وہ ہے جس کے متعلق غالب کہتا ہے ؎

دیکھیو تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اشعار کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے دماغ میں اعلیٰ و اسفل کی تفریق سب سے بالاتر رہنی چاہئے۔ لیکن معیار اعلیٰ میں بھی دو قسم کے معیار ایسے ہیں کہ اگر ہم ہوشیار تر ہیں تو وہ معیار اصلی پر غالب آجائیں گے۔ اور یہ دونوں مغالطاتی ہیں۔ آرنلڈ ان کو "معیار تاریخی" اور "معیار ذاتی" کہتا ہے۔ کسی زبان کی ابتدائی تاریخ میں ایک شاعر جو کسی طرح عامتہ الورود سے اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہے۔ زمانہ کا استاد مان لیا گیا۔ اس کے تلامذہ نے اس کو بڑھا دیا اور ہم بھی ان لفاظیوں کو سن کر اُسے استاد ماننے لگے۔ یہ تاریخی معیار ہے۔

ہمارے ذاتی تعلقات، انس و محبت یا واقعات حاضرہ اکثر ہماری زبان سے شاعر کے حق میں ایسے الفاظ کا اعادہ کرا دیتے ہیں جن کا وہ در اصل مستحق نہیں ہوتا۔ یہ معیار ذاتی ہے۔ تاریخی معیار قدما کے

مطالعہ میں اور ذاتی معیار ہم عصر یا زمانہ حال کے شعراء کے مطالعہ میں ہمارے اصلی معیار پر اثر کرتا ہے۔ اس لئے ہم کو دواوین اور کلیات کا مطالعہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اکثر لوگ جو غالب کے طرفدار ہوتے ہیں غیر منصفی سے کام لے کر ایک کے کلام کو محض بے اصول، بے معنی اور اسفل گردانتے ہیں اور دوسرے کو اس کے مقابلہ میں نہ صرف اعلیٰ بلکہ معائب اور نقائص سے پاک مانتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ موجودہ دیوان غالب میں ایک خاص خصوصیت ہے جو دیگر دواوین میں نہیں۔ کہ اس میں سے تیسرے درجہ کا کلام نکال دیا گیا ہے لیکن پھر بھی بہت سا مواد ایسا ہے جو یقیناً اعلیٰ نہیں کہا جا سکتا۔ برخلاف اس کے ذوق کے دیوان میں اکثر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو غالب جیسا بلند معیار شاعر بھی قابل داد سمجھتا تھا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ طبائع مختلف ہیں، اور معیار ذاتی کی خلل اندازی کا احتمال قوی، اس لئے اصلی معیار کا قائم کرنا جتنا اہم ہے اتنا ہی دشوار بھی۔ اس مسئلہ کا حل بھی ہم کو آرنلڈ کے صفحات سے ملتا ہے۔ جس نے اس موضوع پر کافی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اساتذہ کے مسلم الثبوت اشعار، بند، مصرع بر زبان کر لینے

چاہئیں، اور پھر ان کو بطور محک کے استعمال کر کے کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنی چاہئے۔ یہ ضرور نہیں کہ اشعار ایک ہی موضوع پر ہوں۔ یا ان میں ایک ہی صنعت پائی جاتی ہو۔ بلکہ وہ اشعار جن کو جمہور بلند پایہ کہیں۔ کفالت کریں گے۔ مثلاً غالبؔ کا یہ شعر ہے ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے

اقبالؔ کا یہ بند۔ ؎

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
ڈھونڈھ اب ان کو چراغِ رخِ زیبا لے کر

ذوقؔ کا یہ شعر ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شوقؔ کی مثنوی کے چند اشعار ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے   موردِ مرگِ نوجوانی ہے
صبح دم طائران خوش الحان   پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

میر سے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

یا

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے ہی بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

مومن سے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

انشا سے

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یہ اشعار جو یقیناً ہر شاعر کے بہترین اشعار نہیں، بطور مثال کے لکھے گئے ہیں اور ہر سخن شناس اور صاحب ذوق سلیم کے واسطے راہبر ہو سکتے ہیں۔ ارسطو کا قول ہے کہ "تاریخ پر فن نظم کو محض اس

وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ موخر الذکر میں گو نہ راست بازی اور زیادہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔"

ہماری زبان میں بہت کم اشعار ایسے ہیں جن میں یہ دونوں اصناف پائے جاتے ہوں۔ اور جن میں یہ محاسن موجود ہیں وہ اکملیت کے درجہ کو پہنچ گئے ہیں۔ مثلاً انیس کا یہ شعر ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا اقبال ؎

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

غالب ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

غالب کے ہاں اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بذلہ سنجی اور ظرافت بھی ہے۔ اور اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس ظرافت میں بھی ایک قسم کی سنجیدگی موجود ہے۔ اس کے ہاں ابتذال کا ٹھٹول نہیں۔ بلکہ سنجیدہ ظرافت کی چاشنی اور زندہ دلی ہے۔ مثلاً چند اشعار :-

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

یا

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے
صبح ہوئی اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

یا

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو تو ہے جو کچھ کہو "بجا کہیئے"

یا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یا

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
انسان کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

زندگی بلا مزاح کے نفس کشی ہو جاتی ہے۔ اور یہ چونکہ ہماری روح کو مسرور کرتی ہے لہذا ہم سنجیدہ ظرافت کو بھی حسن تغزل اور اصلیت کے ساتھ اصناف شاعری میں شمار کرتے ہیں۔

کیٹس کہتا ہے کہ حُسنِ تغزل وہ جذبہ ہے جو حُسن اور خوبصورتی کا خواہش مند ہو، اور بقول اس کے "ایک حسین اور لطیف شے دائمی مسرت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔" اس لحاظ سے وہ شعر جس میں حُسن تغزل کا التزام رکھا جائے بہجت اور مسرت کا ہمیشہ جاری رہنے والا سرچشمہ بن جائے گا۔ مثال کے طور پر غالب کے چند اشعار اور مصرع ؎

بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یا

صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

یا

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ایشیائی شاعری میں مبالغہ و اغراق بھی ایک صفت ہے اور یہ اصلیت کے منافی ہے۔ غالب بھی اس وبائے عام سے نہ بچ سکا۔ مگر اس کی جانب داری میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہ مقابلہ اور شعرا کے اس میں اصلیت زیادہ ہے۔ اصلیت سے یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ شاعر کہے وہ امرِ واقعہ ہو۔ بلکہ ہر واقعہ کو اس طور سے بیان کرے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ خواہ ایسا کبھی ہوا نہ ہو۔ یا وہ شعر جس کو سُن کر بے اختیار منہ سے نکل جائے کہ شاعر سچ کہتا ہے۔

مثلاً چند اشعار سے

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

یا

قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

ایک نکتہ داں کا قول ہے کہ نظم انسان کی اکمل ترین تخلیق ہے۔ جس میں وہ صداقت کے بالکل نزدیک آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن نظم میں یدطولیٰ حاصل کرنا آسان نہیں۔ اہل یورپ نے نظم کی تقریظ اور نکتہ چینی کے سخت ترین اصول قائم کئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے مسلم الثبوت شاعر دنیا کے ہر حصے میں بلند پایہ مانے جاتے ہیں۔ ایک شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو انسانی زندگی کی ترجمانی میں مخصوص کر دے۔ چنانچہ شیکسپیر، ڈانٹے، ورڈسورتھ اور گوئٹے اس صفت میں سب سے پیش پیش ہیں اور نام آوری میں بھی سب سے آگے۔

کسی شاعر کے غیر فانی ہونے کے واسطے ضرورت ہے کہ اس کے اشعار اہل زمانہ کے واسطے لابدی اور ناگزیر ہوں۔ جس طرح انسان بلا نیچر کی صناعی کے مسرور نہیں رہ سکتا، اسی طرح بلا اس کلام کے

اُس کو حقیقی مسرت حاصل نہ ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ہمارے خیالات کی ترجمانی کرے۔

انسانی زندگی آفات کو آلام کی پوٹلی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کسی کو جسمانی عوارض کی شکایت ہے تو کوئی روحانی تکالیف سے بے چین۔ شاعر ان کو تسلّی دیتا ہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

اس شعر میں نا اُمید نہ ہوتے اور خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

علائق دنیا سے آزاد رہنے کی صورت۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

یا

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

اس میں بتایا ہے کہ دنیا میں عام طور پر نیکی کو بدی کے پہلو سے لیا جاتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ لوگ برا کہیں گے نیکی کرنے سے ہاتھ روکنا نہیں چاہئے۔

دوئیم یہ کہ ہم اپنے دعادی کے واسطے اس کو مثل ایک خاموش کر دینے والی دلیل کے پیش کر سکیں یا بالفاظ دگر اس کے مصرع اور اشعار بہ طور ضرب الامثال اور روز مرّہ کے پیش کئے جا سکیں۔ اس بادۂ خاص میں غالب تمام اُردو شعراء سے پیش پیش ہے اس کا ایک ثلث کلام بلا مبالغہ لبطور ضرب المثل یا روز مرّہ کے استعمال ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر گو ہزے از خروارے چند اشعار ردیف الف سے ۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

یا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا ہوئی تاخیر کو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

پوری پوری غزلیں ایسی ہیں جو ایک طرح پر "ناگزیر" کہلائی جانے کی مستحق ہیں۔ مثلاً ردیف الف سے سہ

درد منت کش دوا نہ ہوا

یا

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

یا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا

جس طرح ٹامس گرے انگلستان میں وقت موعودہ سے قبل پیدا ہو گیا تھا اسی طرح غالب کا سب سے بڑا قصور اس کے ہم عصروں کی نظر میں اس کا بے وقت پیدا ہونا تھا۔ قطع نظر اس امر کے کہ غالب نے ایک بالکل انوکھا طرز تحریر اور تغزل ایجاد کیا جو عوام الناس کے لئے نا قابل فہم تھا۔ اگر ہم اس زمانہ کی لسانی حالت کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ زبان رفتہ رفتہ بدل رہی تھی۔ میر کی سلاست عرصہ ہوا رخصت ہو چکی تھی۔ گل و بلبل کے افسانہ جو متقدمین کے کلام میں نیچر کی ترجمانی کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انقلاب زمانہ کے باعث متاخرین کے ہاتھوں میں زیور شعر بن گئے۔ شاعری لفاظی، پھبتی، اور گل و بلبل کے افسانوں، ہجر و

وصال کے بیان ۔ شراب وکباب ، شیشہ وساغر تک محدود رہ گئی تھی اور جو شخص ان قیود سے آزاد رہ کر شعر کہنا چاہتا تھا۔ اس کو نہ تو استاد شاعر مانتے اور نہ پبلک ہی میں اس کی کچھ قدر و منزلت ہوئی۔ اُردو شاعری کی قسمت ہمیشہ رؤساء اور سلاطین کے دربار سے وابستہ رہی اور شاعر کو پبلک کے جذبات سے زیادہ اپنے آقا کی مدح کا خیال رکھنا لازمی ہوتا۔ ان آقاؤں میں سے نوّے فیصدی نالائق ، پرانی لکیر کے فقیر اور انھیں پوچ خیالات کے مداح ہوتے تھے اور حفظ مراتب اور تحفظ ملازمت کے لئے لازم تھا کہ شاعر خواہ اپنی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اسی روش پر چلے جو اس کے پیش رو مقرر کر گئے ہیں ۔ غالؔب کو بھی ان قیود سے مفر نہ تھا ، اگرچہ اس کے خیالات فلسفیانہ ، اس کا تخیل ارفع اور نگاہ عمیق تھی ۔ لیکن چونکہ ایک قدامت پسند دربار سے قسمت وابستہ تھی۔ اس لئے یہ جز پامال راہ پر چلنے کے چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس کی شکایت بھی کرتا ہے

؎ ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر

مثلاً جب اُسے غدر دہلی کے بعد مسلمانوں اور سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حالت دکھانی ہوتی ہے تو وہ کچھ اس خیال سے کہ سلطنت کی طرف سے باغی نہ قرار دیا جائے اور کچھ طرز قدیم کو نبھانے کے واسطے مندرجہ ذیل اشعار میں اس کا اعادہ کرتا ہے۔ گو بہ ظاہر اس میں شب وصال کے بعد صبح کا پُرحسرت سماں دکھا کر ۔ ؏

تازہ واردان بساط ہوائے دل

کو نصیحت اور عبرت کی تلقین کی ہے۔ مگر اہل معانی سے پوشیدہ نہیں کہ شاعر کا ماحصل کیا ہے۔

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے

ساقی بہ جلوہٗ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

لطفِ خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور شور نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یا ہندوستان کی قسمت کے نئے مالکوں سے مخاطب ہو کر اپنی کس مپرسی کا اظہار ؎

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

دوسری اقوام کے ساتھ مراعات اور اپنے حق میں ظلم و ستم دیکھ کر غالب جیسے قوم پرست سے صبر نہیں ہوتا اور کہتا ہے ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے   ہم رہیں یوں تشنہ لب ایام کے

غالب نے سلطنت کے واسطے اکثر جام کا لفظ استعمال کیا ہے ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

یا

سلطنت دست بدست آتی ہے   جام مے خاتم جمشید نہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی انھیں خیالات کا اعادہ کیا گیا ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے   لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے   آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ ایام سے گھبرا نہ جائے دل   انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

یا

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے — ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

جن لوگوں کو غدر دہلی کی مستند تاریخ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ اس پر آشوب زمانہ میں کتنے بے گناہ مارے گئے اور قتل ہوئے مندرجہ بالا شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

غالب اپنی وسیع النظری سے سلطنت کی تباہی اور قتل عام کے بعد اپنی قوم کی پستی اور ابتری دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اور پھر آخر میں لاچار و مجبور ہو کر کہتا ہے ؎

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز — تاب لاتے ہی بنے گی غالب

چند لوگوں کا خیال ہے کہ بہ مصداق پیران نمی پرند و مریدان می پرانند غالب خود سیاسیات سے چنداں شغف نہ رکھتا تھا۔ بلکہ مندرجہ بالا اشعار کو شارحین اور تبصرہ نویسوں نے پولیٹیکل معانی پہنا دئے ہیں۔ لیکن علاوہ ان رقعات کے جن میں غدر کے بعد دہلی کی تباہی کا رقعت آمیز نقشہ کھینچا گیا ہے ہمارے پاس چند واضح اشعار بھی اس موضوع پر موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حمیت قومی، واقعہ نگاری اور حب الوطنی قیود "تیشۂ ساغر" پر غالب آئی اور وہ اپنے دلی خیالات کی صحیح اور صاف الفاظ میں ترجمانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مثال کے طور پر اوپر کا شعر ؎

سلطنت دست بدست آتی ہے — جام مے خاتم جمشید نہیں

یادہ غیر مطبوعہ قطعہ ؎

بسکہ فعال مایرید ہے آج — ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(۳)

غالبؔ چونکہ دو جداگانہ عصرین کے درمیان رشتہ منسلکہ ہے۔ اس لئے اس کے ہاں عشق و محبت کے خیالات بھی ملیں گے اور فلسفہ الہیات اور سیاسات کے بھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ جس طرح طرز جدید کا پیغمبر ہے۔ اسی طرح طرز قدیم کا استاد، اور ایک قادر الکلام شاعر کا کمال یہی ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھائے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ مثلاً نیچرل شاعری میں بہار کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچتا ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

اخلاقیات پر کس خوبی سے رقم طرازی کی ہے ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

یا

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیئے

رچرڈ ٹیلر کا قول ہے کہ "ہر شاعر کو فلسفی ہونا لازمی ہے۔ بلا فلسفہ کی آمیزش کے شعر روکھا پھیکا اور بے کیف معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کا کام زندگی کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ اس پر تبصرہ کرنا بھی ہے اور اگر شاعر فلسفی نہیں تو وہ اس صنعت میں عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔"

غالب مصور بھی تھا اور فلسفی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام "ناگزیر" ہے۔ یعنی جس طرح انسانی زندگی کے واسطے نیچر، اس نے سب سے اوّل نکاتِ زندگی کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شعر انسانی زندگی کے فانی اور موجب ملال و آزار ہونے کی فلسفیانہ تصویر ہے۔

اس کا فلسفۂ حیات ابن رشد کے فلسفہ سے ملتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے دو اشعار مشابہت کو واضح کر دیں گے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ہر شخص کو معلوم ہے کہ حیات و ممات لازم و ملزوم ہیں۔ ہر عامی روز و شب ان خیالات کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی جس نظر سے ان تعلقات کو دیکھتا ہے یا ایک شاعر جن الفاظ اور جس طرز میں اس کا اعادہ کرتا ہے وہ صورت حال کو دوسری ہی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ؏

ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

یا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

موت کو ہمیشہ بھیانک اشکال میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ درست نہیں کہ جب زندگی "بندغم" ثابت ہو تو موت ہمیں ان آلام سے آزاد کردے گی۔ غالب سقراط کی طرح زندگی پر موت کو اس وجہ سے ترجیح نہیں دیتا کہ اس کے متعلق علم نہیں کہ زندگی سے بہتر ہوگی یا نہیں۔ بلکہ اسے یقین ہے کہ مرکر انسان ان قیود اور آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ وہ موت کو ایک مغموم (PESSIMIST) کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا جو موجودہ زندگی کو آئندہ کے تاریک خیالات سے ملوث کرتے ہیں۔ بلکہ ایک مسرور (OPTIMIST) بن کر مختلف دلائل اور مثالوں سے ثابت کرتا ہے کہ موت ایک نعمت ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یا

نظر میں ہے ہماری جلوۂ راہ فنا غالبؔ　　　کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یہی وجہ ہے کہ ہم غالبؔ کو اکثر موت کا خواہش مند دیکھتے ہیں۔ چنانچہ علاوہ رقعات کے اشعار میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

یا

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

یا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بے زار ہے

یا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

موت اور زیست کے بعد وہ ہستی، مادہ ہیولیٰ اور دنیا کی ماہیت پر غور کرتا ہے۔ اس باب میں اس کا فلسفہ بارکلے اور اسپنوزہ سے ملتا ہے۔ وہ بھی دنیا کو مایا ہی خیال کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

یا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یا

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے موجود

یا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

یا

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

حیات و ممات کے فلسفہ پر غور کرنے کے بعد وہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر کرتا ہے۔ خاموشی جس کے متعلق ورڈسورتھ کہتا ہے کہ "مردونہ

کا نشان امتیاز اور متوفین کا حق ہے۔" غالب کے خیال میں بھی موت کے مماثل ہے۔ چنانچہ کہتا ہے: ؎

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی — یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

فلسفہ خنداں کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے — دعویٰ جمعیت احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محو عبرتِ انجام گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

وغیرہ۔

زندگی کی ناپائیداری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

یا

تیری فرقت کے قابل اے عمر — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

یا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

یا

رہا کوئی گر تا قیامت سلامت — تو اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

کارلائل کا قول ہے کہ "ہر شخص کے متعلق سب سے ضروری شے اس کا مذہب ہے۔" غالب کا کلام ایسے اشعار سے پُر ہے جس سے ہم اس کے مذہبی خیالات کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہر مذہب و ملت کا پہلا اصول "وحدت" ہے۔ وہ اقوام بھی جو عملی طور

ہر ایک سے زیادہ معبودوں کو سجدہ کرتی ہیں۔ نظریۃً اصول وحدت کو مانتی ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں میں باپ، بیٹا، روح القدس مل کر ایک خدا ہوتا ہے۔ غالب بھی وحدت الوجود کا قائل ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؂

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا　　روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

یا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اپنے رقعات میں ایک جگہ لکھتا ہے "اگر منظور کیجئے تو میں صوفی ہوں، ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں" اشعار میں بھی انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے ؂

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ایک فلسفی ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ غالب جب سبزہ و گل کو دیکھتا ہے تو خود ہی سوال کرتا ہے کہ اگر بہ جز خدائے تعالیٰ کے دنیا میں اور کوئی شے موجود نہیں تو یہ کل کائنات کیا ہے ؂

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے　　نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزۂ گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ ؂

و ہر چیز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں

اور افسوس کرتا ہے کہ کیوں اس نے اس قسم کے شکوک کو دل میں جگہ دی۔

؎ کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

اسے ہر شے میں جلوہ ربانی نظر آتا ہے ؎

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا ارماں اٹھائیے

یا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مثل سرمد شہیدؒ کے جو کہتے تھے کہ "بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم" وہ بھی ہر خاکی پتلے میں وجود باریٔ تعالیٰ کی تجلی دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ ؎

ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

یا

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے   ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس حال میں جو آئے

وہ ارفع ترین ذات کی پرستش کرتا ہے ؎

ہے پرے عالمِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اس کے یہاں رسوم کی قید نہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یا

وفاداری بہ شرط استواری عین ایماں ہے   مرے بت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

غالب ص ۲

وہ کسی معاوضہ کے لئے نہیں بلکہ اپنے معبود کو خوش رکھنے اور صرف پرستش کے خیال سے عبادت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس کا مطمح نظر جنت اور حور و قصور سے کہیں ارفع ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاق نسیاں کا

یا

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ بہشت کا بھی خواہش مند ہے اور شراب کوثر کا بھی۔ مگر اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے کہ عوام دیکھتے ہیں ؎

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

یا

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست   لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

(۳)

اب طرز قدیم کو لیجئے۔ یہاں بھی غالب ہی غالب نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر موضوع وصال ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یا اپنے ضعف اور لاغری کا بیان ؎

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یا شب ہجر کی تلخی درازی، تنہائی وغیرہ کا بیان ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یا

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

یا

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

بدگمانی، رشک اور رقابت میں متاخرین نے بہت مبالغہ کیا ہے۔ مگر غالب ان کو اس خوبی سے نباہتا ہے کہ اس کی افضلیت تسلیم کرنی پڑتی ہے مثال کے طور پر چند اشعار۔ ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لطافت بر طرف نظارگی میں کبھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

یا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

عشق و محبت کے جذبات کا فوٹو اگر نیچرل حالت میں دیکھنا ہو تو غالب کے صفحات کا مطالعہ کیجئے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ دراصل "عشق" ہے کیا چیز۔ اور شاعروں کا عشق کیا بلا ہوتی ہے۔ جس کے متعلق کہتا ہے ؎

ہے سوز جگر میں کبھی اسی طور کا حال آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال کا
بچوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال تھا موجد عشق بھی قیامت کا کوئی

یا

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

تقدیر کا تمسخر تھا کہ غالب جو دراصل فلسفیانہ خیالات کی ترجمانی، الہیات کے بیان اور رموز تصوف کے انکشاف کے واسطے تخلیق کیا گیا تھا مروجہ رسوم کا پابند ہو کر ان فرضی افسانوں میں پڑ جائے۔ مگر نہیں، اس نے اس زمین میں بھی اپنا کمال دکھایا۔ ان قیود کا پابند ہو کر بھی آزاد رہا۔ یہی وہ کمال ہے جس کے متعلق حافظؒ کہتا ہے ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست

اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے عاشقانہ اشعار دیگر شعرا و اساتذہ

سے کچھ زیادہ افضل نہیں۔ لیکن بہ نظر تعمق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انسانی کے حقیقی جذبات کی فراوانی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمن "غالب کے کلام میں ایک نئی دنیا پوشیدہ ہے۔ جس کا پتہ حالی نے لگایا ہے۔ مثال کے طور پر صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کے سطحی اور اندرونی معاملات میں بعد المشرقین ہے ؎

سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
یا
کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
یا
ترے سرو قامت سے اک قد آدم — قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
یا
کون ہوتا ہے حریف دم مرد افگن عشق — ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

متمدن زمانہ میں ہر شخص سوال کرتا ہے کہ "عشق در اصل ہے کیا چیز؟" اور اس کی مختلف طریقہ سے تاویل کرتا ہے۔ ہر شاعر کا عاشق بن جانا تو بجز "خلل دماغ" یا "بچوں کے کھیل" کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر واقعتاً دیکھا جائے تو یہ وہ پاک جذبہ ہے جس سے متاثر ہو کر مولینا رومؒ نے مثنوی جیسی عدیم النظیر کتاب تصنیف کی اور عمر خیام اور سرمد کی زبان سے رباعیات۔ حافظؒ اور خسروؒ کی زبان سے غزلیات کہلوائیں۔

غالب اپنے طرز مخصوص میں اکثر جگہ عشق کی تعریف کرتا ہے۔ اس کی خصوصیات بیان کرتا ہے۔ اور اس کو ہوا و ہوس سے متمیز کرتا ہے۔ "عشق کیا ہے؟"

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہاں پورے طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ عشق جذبہ خود اختیاری نہیں۔ بلا عشق و محبت کے زندگی بے کار اور بے کیف ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا (یا) درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یہاں

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے (یا) انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

جذبۂ عشق بے اثر نہیں ؎

عشق تاثیر سے نومید نہیں (یا) جاں سپاری شجر بید نہیں

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

مگر جب دیکھتا ہے کہ ہر کہنہ و مہ عشق کا دعویدار ہے۔ ہر ہوس راں اپنے آپ کو عاشق کہتا ہے۔ نظارہ بازی کا نام "عشق" رکھا گیا ہے تو شکایت کرتا ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کچھ لوگ عشق کو پرستش خیال کرتے ہیں۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس کا آخری درجہ پرستش سے بھی بڑھ کر ہے۔ غالب کہتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ؏

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

مگر ؎

چھوڑوں گا میں نہ اُس بت کافر کا پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

کیونکہ اس کے نزدیک تو "وفاداری" بہ شرط استواری عین ایماں ہے۔

(۴)

یار کے رخصت ہونے، یاد آنے، اور جانے کے بعد کی تصاویر کتنی دلکش اور مکمل ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی (یا) فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے (یا) کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

شراب کے متعلق اس کے اشعار اور مصرعہ ضرب المثل ہیں ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ایک شاعر ہمیشہ شراب کا خواہش مند رہتا ہے اور کسی صورت میں اس سے سیر نہیں ہوتا۔ ؎

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں (یا) گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ (یا) ہے یوں کہ ہمیں دُرد تہ جام بہت ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے (یا) پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا (یا) یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

(یا پھر)

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

خیالی معشوق کی جفا کاری اور استغنا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے اور اس میں نصیحت بھی کرتا جاتا ہے کہ ؎

دہن شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجئے خوبان دل آزار کے پاس
(یا)
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے (یا) ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

آہ و نالہ، شیون و فریاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر دل سے ہو تو با اثر ثابت ہوتا ہے۔ مگر عملی طور پر اس کا اثر جیسا کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

(یا)
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

بلکہ اس سے درد و کرب میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ؎

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم کہ ہوگا باعث افزایش سوز دروں وہ بھی

بے صبری، بے قراری اور بے کسی کی تصویر یوں کھینچتا ہے ؎

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

اپنے گھر کی ویرانی، خستگی اور تباہ حالی کا شکوہ مختلف طریقہ سے کرتا ہے۔ اور ہر مرتبہ ایک نئی بات پیدا کرتا ہے۔ ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یا

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے (یا) دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

اوپر کے شعر میں پولیٹیکل معانی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

عاشق ہمیشہ غمزدہ رہتا ہے اور اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو زندگی رنج والم کا افسانہ ہے۔ جس میں کہیں کہیں خوشی کی نامعلوم سی جھلک نظر آجاتی ہے ایک شاعر کو موسیقی میں اندوہ والم کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ وہ انھیں راگوں کو زیادہ پسند کرتا ہے جن میں الم افزا تخیل کی فراوانی ہو۔ شیلی اپنی ایک نظم میں کہتا ہے "ہمارے شیریں ترین راگ وہ ہیں جو سب سے زیادہ الم افزا تخیل کی خبر دیتے ہیں۔" اور غالب کہتا ہے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو　　جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ شاعر کی نظر حقیقت بیں ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک زمانہ مصیبت میں مبتلا ہے تو اس کی زبان بے ساختہ واقعات کی ترجمانی کرنے لگتی ہے۔ مثلاً ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے (دیا)

(۵)

غالب بہ لحاظ خیالات، طرز بیان، تشبیہہ اور استعارات کے اوریجنل تھا۔ وہ ہمیشہ عوام کے پا افتادہ راستہ سے گریز کرتا رہا۔ اس کا دماغ ہمیشہ نئی بحروں، نئے استعارات نئی بندشوں اور نئے محاورات کی تلاش اور ایجاد میں منہمک رہتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہ حاتم سے لے کر ذوق اور مومن

تک ہر شاعر چونکہ ایک ہی رنگ میں اور ایک ہی موضوع پر خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کرتا رہا ہے اس لئے اس زمین اور مبحث پر کچھ کہنا نہ صرف دوسروں کا اتباع کرنا ہوگا۔ بلکہ متاخرین اور متقدمین کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کرنا ایک قسم کی زلہ ربائی ہو گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پرانی شاعری آج کل اسی وجہ سے بے کیف نظر آتی ہے کہ اس میں اب نئے خیالات پیدا کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

اس کا جدت پسند دماغ بجز بیدلؔ کے جو خود ایک طرز جدید کا موجد تھا اور کسی کا متبع نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ سب سے اول طرز بیدلؔ ہی میں ریختہ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کے ہاں بجز پیچ در پیچ استعارات اور بعید از فہم تشبیہات کے بلند پروازی تخیل ہیچ ہے۔ اس نے اس روش کو ترک کر دیا اور اس طرز مخصوص کا اجرا کیا جو عصر حاضرہ کی شاعری کا پیش خیمہ تھا۔

دنیا نے جس نظر سے اس پیشرو کو دیکھا وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی۔ کسی نے کہا "اسے خبط ہو گیا ہے کہ اردو زبان میں فارسی محاورات کا بیجا استعمال کرتا ہے۔ کسی نے زبان اور طرز بیان پر اعتراضات کئے اور کسی نے شکایت کی کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

کوئی پھبتی کستا اور کوئی گالی نامہ تیار کرتا۔ ہر مصلح قوم و ملت، ولی پیغمبر یا مبلغ جب اپنا کام شروع کرتا ہے تو ابتدا میں اسے اسی قسم کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی بردباری، علم اور خندہ جبینی ان تمام

مخالفین کو رام کر لیتی ہے۔ غالب نے کبھی ؏ "کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کے مقولہ پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ ان کے جائز اعتراضات پر توجہ کی، فارسی ترکیبیں جو ناموزوں معلوم ہوتی تھیں، ترک کر دیں۔ زبان کو حتی الوسع سلیس کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی زمانہ میں اس کے سیکڑوں مداح اور ناظرین پیدا ہو گئے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ غالب جمہور کا شاعر نہیں۔ وہ صرف ایسے لوگوں کے واسطے شمع ہدایت ہے جو اس کے کلام کو سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً جمہور نہیں۔ کیونکہ عام طور پر ہمارا طبقہ اسفل ناخواندہ اور پست خیال ہے

غدر دہلی سے پیشتر کا زمانہ، جب کہ غالب نے اس رومانی اور فلسفیانہ شاعری کا اجرا کیا کوئی ترقی کا زمانہ نہ تھا۔ ہر قسم کے علوم میں، حتیٰ کہ زبان فارسی میں جو چند سال قبل تک سفلوں کی مادری زبان رہ چکی تھی۔ انحطاط پیدا ہو چلا تھا۔ فلسفہ سے تو ہندوستانی مسلمانوں کو کبھی شغف ہوا ہی نہیں سیاسیات سے وہ لوگ محض بے بہرہ تھے۔ فن تاریخ بھی مثل شاعری کے قدیم طرز پر چلا آتا تھا۔ اس طرح گویا ایک طرف تو ترقی کا دروازہ بند تھا۔ اور دوسری طرف ان کی قدامت پسندی مانع جدّت طرازی تھی۔ عوام سے قطع نظر ان کے خواص بھی تعلیمی حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھے۔ ان کا معیار زباندانی اور سخن فہمی سطحی تھا۔ اس لئے اگر اس زمانہ کے شعراء و مشاہیر اس کے کلام کے نکات، فلسفیانہ خیالات اور غیر مروج استعارات اور بندشوں کو نہ سمجھ سکے تو اس میں ان کا قصور نہیں۔ کیونکہ ان کا نمبر کسی طرح آج کل کے عوام سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ زمانہ کا قصور ہے۔

میرے نزدیک تو یہ اعتراضات جو غالب پر کئے گئے اس کے حق میں مفید ثابت ہوئے۔ اسے موقع ملا کہ اپنے نقائص کی اصلاح کرے[1]۔ اور اپنی زبان کو اگر جمہور کے واسطے نہیں تو عوام اور متوسط طبقہ کے واسطے کچھ سلیس بنائے۔ اور ناجائز اعتراضات اور بے جا نکتہ چینیوں کو سن کر اپنے میں تحمل و بردباری کی عادت پیدا کرے۔ خود شاعر نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ان رکاوٹوں سے اس کی روانی طبع میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کیا جدت طرازیاں ہیں جن کی وجہ سے غالب اس حد تک متہم کیا گیا۔ یہ دو قسم کی ہیں۔ اندرونی اور بیرونی۔ اندرونی جن کا تعلق خیالات سے ہے اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ بیرونی جو زبان اور طرز بیان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آگے آئیں گی۔ فی الحال یہ دیکھنا ہے کہ آیا بلند پروازی تخیل کے واسطے زبان کو بھی وسعت دینے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

اُردو زبان، اس زمانہ کا تو ذکر ہی کیا ہے، آج بھی ناقص اور نامکمل نظر آتی ہے۔ غالب خیالات کی فراوانی اور ارتقاع کے باعث مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے دلی خیالات کو ہو بہو سپرد قلم کرنے کے واسطے الفاظ، استعارات، اصطلاحات

---

[1] یاد رکھنا چاہئے کہ غالب در اصل فارسی کا شاعر تھا نہ کہ اُردو کا۔ چنانچہ جہاں کہیں ذکر آجاتا ہے تو کہہ بھی جاتا ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اور مرکبات ایجاد کرے۔ چنانچہ کہتا ہے۔ ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

لیکن وہ ان کو اپنے دماغ سے نہیں نکالتا۔ بلکہ جس طرح دوسرے الفاظ و محاورات کے لئے زبان اُردو فارسی کی منت پذیر ہے۔ اسی طرح وہ بھی فارسی تراکیب کو اُردو میں داخل کر کے زبان کو وسعت دینا چاہتا ہے اور باوجود لوگوں کی ہٹ دھرمی، قدامت پسندی اور مخالفت کے اس کے پیدا کردہ اکثر محاورات اور مرکبات رائج الوقت ہیں۔ مثال کے طور پر ستایش، غلط بردار، چراغ کشتہ، وارستگی، آتش خاموش وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ بقول عبدالرحمٰن بجنوری "شاعری منطق سے آزاد ہے تو قواعد فصاحت ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اشعار میں لطافت پیدا کرنا جو شاعر کا اہم ترین فرض ہے، قواعد زبان کے اختیار سے باہر ہے۔ شیکسپیر اور غالب جیسے قادر الکلام شعراء کا کام قواعد کی پابندی نہیں، بلکہ یہ قواعد کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے۔ مثال کے طور پر میں صرف ایک شعر لیتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ شاعر کس طرح اپنے الفاظ کو تولتا ہے۔ ؎

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا

ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

اس شعر میں "حرفِ وفا" قواعد کی رو سے غلط ہے۔ "لفظ وفا" صحیح قائم مقام ہو گا۔ لیکن جب ہم مصرعہ کو اس طرح پڑھتے ہیں۔ ؎

ایک جا لفظ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا

تو بیّن طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کلام کی سادگی، لطافت اور بے ساختگی نیست ہو گئی۔

اس مثال سے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ ایک مسلم الثبوت شاعر کے ہاتھ میں الفاظ مثل کٹھ پتلی کے ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرے۔ بلکہ یہ کہ غالبؔ الفاظ کے حقیقی اثرات سے بھی واقف تھا۔

بیرونی جدّت کی پہلی مثال الفاظ، محاورات، مرکبات اور استعارات کو فارسی زبان سے ترجمہ کرنا یا اُردو سانچہ میں ڈھالنا ہے جس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر ہٹ دھرمی اور بے جا تعصب سے کام نہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس طرح اس نے ہماری زبان کی بڑی خدمت کی، مگر افسوس کہ جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں اسی طرح مشکل اور دقیق کے ساتھ سہل اور ممکن الحصول محاورات کو بھی اس زمانہ کے قدامت پسند طبقہ نے مسترد کر دیا اور زبان کی وسعت وہیں کے واسطے جو کوشش غالبؔ نے کی تھی وہ نقش بر آب ثابت ہوئی۔

دور حاضرہ میں ماہر لسانیات کو کماحقہ اندازہ ہوگیا کہ زبان اردو بہت ناقص اور نامکمل ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کو انگریزی قواعد کی مطابقت سے وسعت دی جائے۔ غالبؔ کا کمال صرف اس بات سے ظاہر ہے کہ جس ضرورت کا ہم کو آج احساس ہو رہا ہے شاعر اس سے ایک صدی قبل ہی واقف تھا۔

مثال کے طور پر چند اختراعی الفاظ اور محاورات درج ذیل ہیں:۔
دام شنیدن، موج رنگ، محشر خیال، یک شہر آرزو فردوس گوش، استغناء، کالبد، صورت دیوار، دعوت آب و ہوا وغیرہم۔

ابوالفضل کی طرح غالب بھی خود اپنے ایجاد کردہ اصولوں پر چلتا ہے۔ اس کا دماغ ہمیشہ کسی نئی چیز کی اختراع یا جدت کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کا منطقیانہ اور فلسفیانہ دماغ نہیں سمجھ سکتا کہ جب متقدمین اور متاخرین نے نئی بحروں اور نئے محاورات کا استعمال کیا تو وہ کیوں اس سے گریز کرے۔ چنانچہ اس نے ان بحور کو ایجاد کیا جن کو عبدالرحمٰن بجنوری نے "افتاں وخیزاں وبحریں" کہا ہے۔ تعصب کی اور بات ہے۔ لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو جو سادگی اور بے اختیاری ان بحروں میں نظر آتی ہے وہ عدیم النظیر ہے۔ مثال کے طور پر ؎

دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا　　کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

طاقت بے داد انتظار نہیں ہے　　آ کے مری جان کو قرار نہیں ہے

کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں ہے دو قدم آگے　　عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

یا

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے　　کہتے ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے

لیکن آج تک صرف ایک شخص ایسا پیدا ہوا ہے جس نے ان بحور کو قدر کی نظر سے دیکھا اور یہ وہ ہستی ہے جس کے متعلق ایک دنیا کہہ سکتی ہے کہ اس نے غالب کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ جس نے دیوان غالب کو مقدس وید کا ہم پایہ کہا ہے اور جس کے الفاظ سے ہمارا یہ مضمون شروع ہوتا ہے۔

(۶)

ورڈسورتھ کے متعلق لوگ سوال کرتے تھے کہ اس کے کلام کی خوبی کس قسم کے اشعار اور نظموں میں ہے۔ جس کے جواب میں میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ اس کی چھوٹی اور

یس نظمیں اس کے طرز مخصوص کی حامل ہیں۔ غالب کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا
ہے کہ "اس کی چھوٹی بحر کی نظمیں تیر و نشتر ہیں"

مگر یہ کہنا کہ غالب کا کمال ان چھوٹی غزلوں تک محدود ہے، زیادتی ہے
البتہ اس امر سے کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ غزلیات اس کی تیر و نشتر
ہیں۔ جہاں سادہ و سلیس عبارت کے پردہ میں چھپے ہوئے خیالات پوشیدہ ہیں
جو دل میں فوراً چٹکی لیتے ہیں۔ ان کے متعلق سب سے ضروری بات یہ ہے کہ
مثل سعدی کی بوستاں کے ان کو بھی سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ دعوی کے ساتھ
کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی غزلیات سے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے   نالہ پابند نَے نہیں ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری   اور پھر وہ بھی زبانی میری

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے   سینہ جویائے زخم کاری ہے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے   ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

عشق تاثیر سے نومید نہیں   جاں سپاری شجر بید نہیں

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے   یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

کہنا صرف میر یا غالب جیسے قادر الکلام اساتذہ کا حق ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے
کہ اس طرزِ و زبان میں اشعار کہنا چنداں دشوار نہیں۔ مگر جب اس کام
میں ہاتھ ڈالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا مقابلہ کرنا۔ ع
سورج کو چراغ دکھانا ہے

GHALIB AUR USKI SHAIRI

AHMAD UDDIN AHMAD — Rs. 12/-

اشاعتی سلسلے

لکچرس سیریز:-

کتاب	مصنف	قیمت
محمد حسین آزاد	ساحل احمد	۶/=
غالبؔ کی ہندوستانیت	"	۱۰/=
خضر راہ	"	۶/=
گاندھیائی تحریک اور نہرو	"	۶/=
فیض کی شاعری	درشہوار ابراہیم، ساحل احمد	۶/=
اردو غزل ایک مطالعہ	ساحل احمد	۶/=
ترقی پسند اردو شاعری	اشفاق حسین	۱۰/=
شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی	عبادت بریلوی	۱۰/=
نئی غزل میں فساد و شر کے اثرات	ساحل احمد	۶/=
نئی غزل ایک مطالعہ	"	۶/=
اردو مرثیہ ایک مطالعہ	"	۱۰/=
اردو قصیدہ ایک مطالعہ	"	۱۰/=
اردو نظم ایک مطالعہ	"	۱۰/=
بال جبریل	اثر لکھنوی، ساحل احمد	۶/=
تین کتابیں	ساحل احمد	۶/=

مونوگراف:-

کتاب	موضوع / مصنف	قیمت
سید ماجد الباقری	شاعری	۶/=
پروین شاکر	"	۶/=
شمیم طارق	"	۶/=
ارمان نجمی	"	۶/=
مخدوم محی الدین	"	۶/=
مجید امجد	"	۶/=
ناصر کاظمی	"	۶/=

لِٹل بک سیریز

کتاب	مصنف	قیمت
مرزا داغ دہلوی	سید محمد فاروق	۱۵/=
غالبؔ اور اسکی شاعری	احمد الدین احمد	۱۲/=
میر حسن کی غزل گوئی	ساحل احمد	۲۰/=
اقبالؔ کی غزلیں	"	۲۰/=
اردو نظم اور اس کی قسمیں	"	۲۵/=
الہ آباد میں شعر و ادب کی رفتار	"	۲۵/=
دوازدہ	"	۲۰/=

URDU WRITER'S GUILD, ALLAHABAD